Date of Publication : 02-08-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 August 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 August 2014
Issue: 30, Vol.:73

۸ تا ۱۴ اگست ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۳۰، جلد نمبر: ۷۳

علی سردار جعفری کی یاد میں

ولادت: 29 نومبر 1913 ——— وفات: یکم اگست 2000

سلام بن رزّاق
603-B، نیو آکار سی ایچ ایس
بالمقابل حیدری مسجد، نیا نگر
میرا روڈ (ایسٹ)، تھانے-401107
Email: zahirzahida@gmail.com

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دل پروانہ چراغاں، پر بلبل گلنار

اردو کی ادبی تحریکوں میں ترقی پسند تحریک سب سے زیادہ توانا اور دور رس نتائج کی حامل رہی ہے۔ اس کے اثرات پورے برصغیر کے ادب بلکہ تیسری دنیا کے ادب میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

اردو کی نابغۂ روزگار شخصیت علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ وہ آخری دم تک اس تحریک سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے قلم سے جبر و استحصال، ناانصافی اور تشدد کے خلاف جہاد کیا ہے۔ ایک دانشور کی حیثیت سے انھوں نے ایک بہتر سماج کا خواب دیکھا اور ایک شاعر کی حیثیت سے عمر بھر اس خواب کی عکس بندی کرتے رہے۔

بعض شخصیتیں اپنے کارہائے نمایاں کے سبب اس قدر مقبول ہوتی ہیں کہ وہ اکثر عوام کے درمیان موضوع بحث بن جاتی ہیں اور اپنی زندگی میں ہی ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جعفری صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ ان کی شاعری، ان کی کوئی کتاب، ان کی گفتگو، ان کی تقریریں، ان کے مضامین، ان کی فلمیں، یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا معمولی سے معمولی فقرہ بھی فوراً موضوع بحث بن جاتا تھا۔ یہ ان کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ جعفری صاحب میرے لیے بھی شروع سے ایک ہیرو اور آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں جب ہائی اسکول میں پڑھتا تھا تو ان کی نظم 'زندگی کا ترانہ':

یہ سب رعنائیاں یہ دلکشا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

نصاب میں شامل تھی۔ طلبہ اس نظم کو بڑے جوش و خروش سے پڑھتے تھے۔ انھی دنوں جعفری صاحب کی مشہور نظم 'ایک خواب اور' 'ہماری زبان' میں شائع ہوئی تھی۔ غالباً یہ ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا۔ مجھے یاد ہے اس نظم پر ملتفی حمید بابوری صاحب اور وارث کرمانی صاحب نے 'دست بریدہ میں گلاب'، 'مشتعل آئینہ'، 'شعلۂ بکف موج سراب' جیسی تراکیب پر کچھ اعتراضات اٹھائے تھے۔ اپنے آئیڈیل شاعر پر یہ اعتراضات مجھے ناگوار معلوم ہوئے۔ میں نے جذبۂ عقیدت سے مغلوب ہو کر جعفری صاحب کی حمایت میں 'ہماری زبان' کو ایک مراسلہ داغ دیا۔ آل احمد سرور صاحب 'ہماری زبان' کے مدیر تھے۔ اس وقت میں کیا اور میرا مراسلہ کیا مگر خلاف توقع وہ مراسلہ 'ہماری زبان' میں شائع ہو گیا۔ مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ کئی دن تک اس کا سرور قائم رہا۔ اور میں ہفتوں 'ہماری زبان' کا وہ شمارہ بغل میں دبائے گھومتا رہا۔ جعفری صاحب کو تو شاید وہ بات یاد بھی نہیں۔ مگر وہ مراسلہ میری فائل میں آج بھی محفوظ ہے۔

میں ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۶۳ء میں بمبئی آ گیا تھا۔ غالباً ۶۵-۱۹۶۴ء میں پہلی بار جعفری صاحب کو ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی شخصیت کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ بمبئی میں رہتے ہوئے بھی ایک عرصہ تک ان سے ملنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جلسوں اور مشاعروں میں انھیں دور دور سے دیکھتا، سنتا اور دل ہی دل میں غالب کا یہ مصرعہ دہراتا رہتا تھا:

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر

ان سے بالمشافہ ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔

میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'نئی دوپہر کا سپاہی' شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعے پر سب سے پہلے ڈاکٹر قمر رئیس نے خط لکھا تھا اور مجموعے کی خوب پذیرائی کی تھی۔ الٰہ آباد کے ایک سیمینار میں ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اسی دوران ان کا بمبئی آنا ہوا۔ مہاتما گاندھی میموریل ہال میں کوئی جلسہ تھا۔ جلسے کے اختتام پر میں ان سے ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ قریب ہی جعفری صاحب کھڑے کسی سے محو گفتگو تھے۔ قمر صاحب نے جعفری صاحب سے تعارف کرا دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ جعفری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

"بھئی یہ بمبئی ہی میں رہتے ہیں لیکن کبھی ملے نہیں۔"

میں کیا بولتا۔ ایک عجیب مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد بمبئی کے ادبی جلسوں اور نشستوں میں ان سے جب بھی ملاقات ہوتی میں آگے بڑھ کر سلام کرتا۔ مسکرا کر خیریت ضرور پوچھ لیتے۔

اردو کی نابغۂ روزگار شخصیت علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ وہ آخری دم تک اس تحریک سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے قلم سے جبر و استحصال، ناانصافی اور تشدد کے خلاف جہاد کیا ہے۔ ایک دانشور کی حیثیت سے انھوں نے ایک بہتر سماج کا خواب دیکھا اور ایک شاعر کی حیثیت سے عمر بھر اس خواب کی عکس بندی کرتے رہے۔
بعض شخصیتیں اپنے کارہائے نمایاں کے سبب اس قدر مقبول ہوتی ہیں کہ وہ اکثر عوام کے درمیان موضوع بحث بن جاتی ہیں اور اپنی زندگی میں ہی ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جعفری صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ ان کی شاعری، ان کی کوئی کتاب، ان کی گفتگو، ان کی تقریریں، ان کے مضامین، ان کی فلمیں، یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا معمولی سے معمولی فقرہ بھی فوراً موضوع بحث بن جاتا تھا۔ یہ ان کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

جعفری صاحب اکثر تقریر کرتے ہوئے اپنے لمبے بالوں کو اپنی فراخ پیشانی سے اس ادا سے سرکاتے تھے کہ ایک تصویر سی کھنچ جاتی تھی۔ نوجوانوں کو ان کا یہ اسٹائل بہت پسند تھا۔ اس زمانے میں دو اشخاص کے بال بہت مشہور تھے۔ عوام میں دلیپ کمار کے اور ادبی حلقے میں جعفری صاحب کے۔ ہمارے ایک شناسا نے جنھیں شاعری سے تھوڑا شغف تھا، جعفری صاحب کی تقلید میں انہی کی طرح لمبے لمبے بال رکھ لیے۔ ہم اسے اکثر رسول حمزہ کی نظم کا ایک ٹکڑا سنا کر چھیڑا کرتے تھے کہ ''تم نے لیونا سائی کی طرح ٹوپ تو خرید لیا ہے مگر اس جیسا سر کہاں سے لاؤ گے۔''

جعفری صاحب سے قربت سب چاہتے تھے مگر ان کی شخصیت میں کچھ ایسا رعب، کچھ ایسا رکھ رکھاؤ تھا کہ ان سے قریب ہونے کی جرأت کم ہی لوگ کر پاتے تھے۔ لیکن جب کوئی ان سے ایک بار مل لیتا تھا ان کی سحر انگیز شخصیت کا جادو، ان کا دلنواز طرز گفتگو اور ان کے بصیرت افروز خیالات سے ایسا متاثر ہوتا کہ عمر بھر انہی کا دم بھرتا رہتا۔

بعض کا خیال ہے کہ جعفری صاحب کی شخصیت میں نرگسیت کا عنصر شامل تھا۔ نیز چونکہ انھوں نے کبھی کسی کو پروموٹ نہیں کیا۔ خاطر نشان رہے کہ ادب میں کوئی کسی کو پروموٹ نہیں کرتا۔ یہاں پروموشن انہی کو ملتا ہے جو اپنی ٹھوکروں سے راہ کے روڑے ہٹاتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں۔ ویسے میرا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے کہ جعفری صاحب اپنے سے چھوٹوں سے بھی نہایت شفقت سے ملتے تھے۔ گھر جاؤ تو ہزار مصروفیت کے باوجود بیٹھ کر پوری دل جمعی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ رخصتی پر بھی دروازے تک تو کبھی لفٹ تک پہنچانے آتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار مہاراشٹر کالج میں کوئی ادبی نشست تھی۔ جعفری صاحب اور ظ۔ انصاری صاحب بھی مدعو تھے۔ کسی نے نشست کی صدارت کے لیے جعفری صاحب کا نام پیش کیا۔ جعفری صاحب نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''بھئی آخر ہم لوگ کب تک صدارت کرتے رہیں گے۔ نئے لوگوں کو بھی آگے آنا چاہیے۔''

پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''میں اس نشست کی صدارت کے لیے سلام بن رزاق کا نام پیش کرتا ہوں۔''

ظ۔ صاحب نے تائید کی اور خاکسار کو صدر بنا دیا گیا۔ وہ نشست میری زندگی کی یادگار نشست تھی۔

ایک بار میں نے بمبئی میونسپل کارپوریشن کے اساتذہ کے جلسے میں انھیں مدعو کیا۔ انھوں نے فون پر ہی دعوت قبول کرلی۔ تشریف لائے اور تعلیمی مسائل پر ایسا فکر انگیز لیکچر دیا کہ کارپوریشن کے اساتذہ آج بھی بڑے جوش و خروش سے اس لیکچر کا ذکر کرتے ہیں۔ مجھے ان کی ایک اور تقریر یاد ہے۔

ایک مرتبہ بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی جانب سے اردو غزل پر توسیعی خطبے کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو مدعو کیا گیا تھا۔ صدارت جعفری صاحب کی تھی۔ نارنگ صاحب نے اردو غزل پر تقریباً ایک گھنٹے کا ایسا وقیع، رس اور فکر انگیز لیکچر دیا کہ محفل نارنگ صاحب کی سحر بیانی کی قائل ہوگئی۔ توسیعی خطبے کے بعد جعفری صاحب کی صدارتی تقریر تھی۔ نارنگ صاحب کے اس جامع اور وقیع خطبے کے بعد اس موضوع پر خیال آرائی کرنا آسان نہیں تھا مگر جب جعفری صاحب کے لب اعجاز وا ہوئے اور انھوں نے اپنے مخصوص دل پذیر انداز میں بولنا شروع کیا تو ایسا لگا جیسے گنجینۂ معنی کا طلسم کھل گیا ہو۔ اس روز نارنگ صاحب کے خطبے نے سامعین کو سرشار کردیا تو جعفری صاحب کی تقریر نے اس سرشاری کو کیف و انبساط میں بدل دیا۔

ایسی ہی ایک محفل میں جعفری صاحب نے کسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے لفظ آتش کو بالکسر استعمال کیا محفل میں رشید حسن خان صاحب بھی موجود تھے۔ تقریر کے بعد چائے کے وقفے میں رشید حسن خان صاحب نے جعفری صاحب سے کہا 'آتش فارسی لفظ ہے جس میں ت بالفتح پڑھا جاتا ہے۔'

جعفری صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ صحیح فرما رہے ہیں اگر میں اس لفظ کو فارسی میں ادا کروں گا تو آتَش ہی کہوں گا مگر اردو میں اس لفظ کو بالکسر اپنا لیا گیا ہے لہٰذا ہم اردو میں اسے آتِش ہی کہیں گے۔''

خان صاحب گردن ہلا کر خاموش ہوگئے۔ بزرگوں کی محفلوں میں تو آموزوں کے لیے ایسی بہت سی باتیں سیکھنے کی ہوتی ہیں۔

مجھے اردو اکیڈمی میں دو سال تک ان کی ہم نشینی کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ ان دو سالوں میں انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملا۔

یہ روایت رہی ہے کہ ہر بڑے ادیب اور شاعر پر بعض کج فہم اور کم سواد لوگوں نے بے بنیاد قسم کی نکتہ چینیاں بھی کی ہیں۔ غالباً اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ ہر بڑا ادیب یا شاعر اپنے قارئین کا آئیڈیل یا ہیرو ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے تقریباً مافوق البشر ہستی سمجھنے لگتے ہیں لہٰذا اس کی معمولی خامی کو بھی خواہ مخواہ معیوب شئے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ فنکار بھی انسان ہوتے ہیں ان میں بھی چھوٹی موٹی خامیاں ہوسکتی ہیں ہمیں عظیم انسانوں کے عظیم کارناموں پر نظر رکھنی چاہیے۔ تنقید کرنے کے لیے پہلے ہمیں خود اپنا قد بلند کرنا چاہیے۔ ورنہ گلی محلے کے بونوں کی طرح خواہ مخواہ کی نشتر زنی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لیے بہت پہلے کہا گیا ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔

جعفری صاحب کی نظمیں، غزلیں، مضامین اور تقریریں ہمیں امید، رجائیت اور روشن مستقبل کا پیغام دیتی ہیں۔ جعفری صاحب کے ادبی کارناموں کا جائزہ لینے کے لیے دفتر درکار ہے۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ ہمارے نقادوں نے ان پر لکھتے ہوئے صریحاً بخل سے کام لیا ہے۔ اس کا شکوہ جعفری صاحب کو بھی تھا۔

ان کی شاعری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس سے بھی کم ان کی نثر پر لکھا گیا ہے جب کہ ان کی نثر نے ادب میں ایسے چراغ روشن کیے ہیں جن کی روشنی میں آنے والی نسلیں ایک طویل مسافت طے کرسکتی ہیں۔ پیغمبران سخن، ترقی پسند ادب، اقبال شناسی، لکھنؤ کی پانچ راتیں، ان میں سے ہر کتاب کو عصری اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ بالخصوص لکھنؤ کی پانچ راتیں، اردو یادنگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جعفری صاحب نے معمولی باتوں کو بھی اپنی نثر کے جادو سے غیر معمولی بنا دیا۔ مثال کے طور پر پہلی رات میں چاند کے گیت کا 'بول اری او دھرتی بول راج سنگھاسن ڈانواں ڈول'، کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون سے پہلے بھی ہم سب نے وہ نظم پڑھی ہوگی مگر جعفری صاحب نے جس انداز سے اس کا ذکر کیا اس کے پس منظر میں وہ نظم اردو کے ہر قاری کے ذہن پر ایک انمٹ نقش چھوڑ جاتی ہے۔

جعفری صاحب نے شروع میں چند افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ شمع تغافل کے نام سے ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میگزین میں چھپا تھا۔ 'منزل' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا تھا۔ ان افسانوں پر کرشن چندر کا اثر بہت صاف دکھائی دیتا ہے۔

البتہ ان کا ایک افسانہ یا افسانہ نما رپورتاژ 'چھوٹا ٹیپی' اپنی خوبصورت نثر اور دل پذیر ماجرے کے سبب ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں اردو افسانے کے افق پر کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت آپا چھائے ہوئے تھے مگر جب ہم 'چھوٹا ٹیپی' کو ان بڑے افسانہ نگاروں کی تحریروں کے سیاق میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو یہ افسانہ ہر اعتبار سے ایک شاہکار افسانے کے معیار کو چھوتا نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ اس عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر میں آج بھی ایک کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹا ٹیپی، ایک عمدہ تجزیے کا متقاضی ہے۔

جعفری صاحب کے خطوط کے چند اقتباسات جو 'گفتگو' کے ترقی پسند ادب نمبر میں شائع ہوئے ہیں، عمدہ ترین نثر کا نمونہ ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے سلطانہ آپا کو لکھے تھے۔ خطوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں اس عہد کی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ اس زمانے کی ادبی فضا کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جدید فکشن میں رمز و استعارے کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ جعفری صاحب نے اپنی نثر میں جگہ جگہ استعارات اور علامات کے ایسے موتی بکھرے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲۷؍ستمبر ۱۹۳۹ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''جب سے اخبار میں بمبئی کی طوفانی بارش کی خبر پڑھی تمہارے خط کا انتظار کر رہا تھا۔ جھانسی میں بھی خوب بارش ہوئی۔ یہاں کی تتلیاں اور پروانے بڑے خوب صورت ہوتے ہیں۔ ان کے پروں کے رنگ اور نقش و نگار بہت ہی نازک ہیں۔ رات کو بجلی کی روشنی میں دیواروں اور میز پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے رنگین جسم اور پر چاندی اور سونے کی طرح جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں۔ میں نے کئی تتلیاں تمہارے لیے پکڑ رکھی ہیں۔ دیکھنا وہ کتنی حسین ہیں۔ ایک تتلی کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ میں رات کو بستر پر لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا کہ وہ اڑتی ہوئی آئی اور بجلی کے قمقمے کے گرد چکر لگانے لگی۔ اس کا بدن سرخ تھا اور پر کالے جن پر سنہرے نقش تھے۔ وہ اڑتے وقت زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر ایک سگریٹ کی ڈبیا میں بند کرلیا۔ صبح اسے دیکھنے کے لیے ڈبیا کھولی تو وہ پھر سے اڑ گئی۔ لیکن جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی بہت سی چڑیاں اس کی طرف لپکیں وہ چڑیوں کو کئی غوطے دے کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک کوا آیا اور اسے چونچ میں دبا کر اڑ گیا۔ میں کئی رات سے انتظار کر رہا ہوں لیکن ویسی تتلی پھر نہیں آئی۔''

کیا یہ پوری عبارت استعاراتی انداز بیان کی بہترین مثال نہیں پیش کرتی۔ خاطر نشان رہے کہ یہ خط ۱۹۳۹ء میں جیل سے لکھا گیا تھا۔ ہندوستان آزاد ہوکر تقسیم کے عذاب سے گزر چکا تھا۔ بائیں بازو کے دانشوروں نے اس لہولہان آزادی کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ فیض صبح آزادی کو شب گزیدہ سحر کا نام دے چکے تھے۔ اس پس منظر میں یہ پوری عبارت اس عہد کی سیاسی صورت حال کا استعارہ بنتی نظر آتی ہے۔

اس مختصر سے تاثراتی مضمون میں جعفری صاحب کی نثر پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ چند سطریں محض خراج عقیدت کے طور پر پیش کردی گئی ہیں۔ سردار جعفری ایک شخص کا نہیں ایک عہد کا نام تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی رحلت کے ساتھ اردو زبان و ادب کے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

(زیر ترتیب کتاب 'تذکرے سے')

●●●

پرانی فلمی یادیں

فلمی دُنیا کے رازہائے سَربستہ

پہلی قسط

دشوا ناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا، یوپی 201303)

- ایک کہانی جسے ایک ہی ہدایت کار نے تین بار فلمایا اور ہر بار فلم کامیاب رہی
- فلم 'پاکیزہ' کا پُراسرار قبرستان جسے کمال امروہی نے خواب میں دیکھا تھا
- ہندوستان کی پہلی سوشلسٹ فلم 'ہم لوگ' جس کی پذیرائی مزدور بستیوں میں ہوئی
- سیکڑوں فلمیں تیار کرنے والا رنجیت اسٹوڈیو جس کے مالکان سڑک پر آ گئے
- کیدار شرما کی فلم 'چتر لیکھا' میں ہیروئن مہتاب کے غسل کا ہنگامہ خیز منظر
- باکمال رقاصہ سادھنا بوس جسے بھکارن کی موت نصیب ہوئی
- لمبے بالوں والی اداکارہ رتن بائی جسے ایک ولی عہد نے ملکہ بنانے کا عزم کیا
- علامہ اقبال کی گود میں کھیلنے کا شرف حاصل کرنے والی مغنیہ خورشید

دنیا کی کسی فلم انڈسٹری میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک ہی فلم ساز، ایک ہی ہدایت کار نے ایک کہانی کو تین بار فلمایا ہو اور ہر بار اس کی فلم ہٹ رہی ہو مگر ہندوستان میں یہ کرشمہ ہو چکا ہے۔ 1931 میں جب متکلم فلموں کا آغاز ہوا تو پروڈیوسر ڈائرکٹر اے آر کاردار نے لاہور میں ایک فلم 'آوارہ رقاصہ' بنائی جس میں مرکزی کردار گل حمید اور رقیہ سلطانہ نے انجام دیے تھے۔ گل حمید لاہور کا سب سے خوب رو ہیرو تھا۔ ہیرالال نے اس فلم میں ایک ایسے ولن کا پارٹ ادا کیا تھا جو ایک آنکھ سے محروم تھا۔ اس کی اداکاری بہت پسند کی گئی تھی۔

کچھ عرصہ بعد کاردار بمبئی منتقل ہو گیا اور اس نے اسی کہانی پر نئی فلم 'سلطانہ' تیار کی جس میں ہیرالال نے ایک بار پھر ایک شیطان صفت ولن کی ایکٹنگ کی۔ فلم بینوں نے اس کی کردار نگاری کی تو تعریف کی لیکن اسے جی بھر کے گالیاں بھی دیں۔ وہ جب بھی کسی پکچر میں ولن کا کام کرتا تھا بھرپور گالیاں کھاتا تھا۔ ہیرالال خوش ہوتا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ اسے زیادہ سے زیادہ گالیاں دیں کیوں کہ اسی میں اس کی کامیابی مضمر تھی۔ فلم 'سلطانہ' تجارتی اعتبار سے بڑی کامیاب ثابت ہوئی اور کاردار کے وارے نیارے ہو گئے۔ اس کا ہر قدم کامرانی کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اسے بہترین فلم کار تسلیم کر لیا گیا اور ہر سال وہ تین چار فلمیں تخلیق کرتا رہا۔ بی بی کاردار پروڈکشنز فلمیں بنانے کی فیکٹری بن گیا اور پریل بمبئی میں اس کا فلم اسٹوڈیو بھی تعمیر ہو گیا۔

1949 میں خانہ بدوش قبیلے کی یہی کہانی 'دلاری' کے نام سے سامنے آئی جس میں مدھوبالا، گیتا بالی، سریش اور امر کمار نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس فلم کا میوزک نوشاد نے دیا تھا اور گیت شکیل بدایونی نے تحریر کیے تھے۔ سبھی دھنیں مقبول ہوئیں اور زبان زد عام ہو گئیں۔ کاردار بہت خوش تھا کہ تیسری بار بننے والی اس کی یہ فلم کاروباری لحاظ سے بہت اچھی ثابت ہوئی۔

جن دنوں کمال امروہی کی فلم 'پاکیزہ' زیر تکمیل تھی، کہانی کی ضرورت کے مطابق انھیں ایک انوکھے قبرستان کی تلاش تھی جو ماحول کو پُراسرار بنا کر اسے ایک ڈرامائی شکل دے سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس منظر کی کیفیات کو کیمرے کے مختلف زاویوں سے اس طرح فلمایا جائے کہ تماش بین تجسس میں پڑ جائیں اور ان کی نگاہیں اس پر جم کر رہ جائیں۔ ایسا قبرستان اسٹوڈیو میں تعمیر نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کو ہندوستان کے کسی مقام پر ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کمال صاحب اسی سوچ و فکر میں مستغرق تھے کہ ایک رات عالم خواب میں ایک ایسا ہی عجیب و غریب قبرستان نظر آ گیا جو ان کے منصوبے کو حقیقت میں بدل دے۔ وہ اس خوابی قبرستان کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ انھیں ہزاروں میل کا سفر اختیار کرنا پڑا جس کے دوران متعدد خطرات پیش آئے۔ ان کے رفقا کا خیال تھا کہ ایسا تصوراتی قبرستان جو محض خواب میں ابھرا ہو شاید ہی ہندوستان بھر میں کہیں مل سکے۔ کمال امروہی کا اعتقاد یہ تھا کہ تخیلات کی پرواز محض خیالی نہیں الہامی بھی ہوتی ہے۔ ان کا سفر جاری رہا جس پر کثیر رقم خرچ ہوئی۔ آخر ایک روز یہ معجزہ ہو گیا اور ایک گمنام مقام پر ایسا قبرستان نظر آ ہی گیا۔ گورکنوں نے بتایا کہ رات کے سناٹے میں اکثر روحیں یہاں بھٹکا کرتی ہیں اور ان کی درد بھری پکار اکثر سنائی دیتی ہے۔ نزدیک جانے کی سعی کریں تو پھر وہی سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔

کئی روز کی کاوشوں سے یہ منظر اداکارہ مینا کو ساتھ لے کر بحسن و خوبی فلما لیا گیا۔ شوٹنگ کے دوران آندھی کا چلنا اور گرد و غبار اڑنا، سوکھے پتوں کا فضا میں تحلیل ہونا اور سائیں سائیں کی آواز پیدا ہونا، ان سب نے مل کر منظر کو واقعی حیرت انگیز بنا دیا۔ مسلم یا عیسائی معاشرے کے پس منظر میں بننے والی کئی فلموں میں قبرستان دکھائے گئے لیکن 'پاکیزہ' جیسا محیّر العقول قبرستان کہیں دکھائی نہیں دیا۔

فلمی مصنف اور ہدایت کار ضیا سرحدی پٹھان نسل سے تھے اور متحدہ ہندوستان کے صوبہ سرحد (حالیہ نام: خیبر پختون خوا) کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں وہ اپنے والد سے ملنے ملکن جا رہے تھے کہ سنگاپور پہنچ کر اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور واپس آ کر ہندوستان کی سیاحت شروع کر دی۔ وہ بمبئی پہنچے اور محبوب خان سے ایک اسٹوڈیو میں ملاقات ہوئی جو ان دنوں ساگر موویٹون کی پکچروں میں چھوٹے موٹے کردار انجام دیا کرتے تھے اور کسی اچھے چانس کے منتظر تھے۔ ضیا کو بمبئی کی فلم نگری میں کوئی موقع نہ ملا تو وہ کلکتہ چلے گئے اور ایسٹ انڈیا فلم کمپنی میں معاون ڈائرکٹر کے طور پر ملازم ہو گئے۔ یہ ملازمت جلد ہی ختم ہو گئی اور وہ پھر بمبئی پہنچ گئے جہاں محبوب ترقی کر کے ساگر موویٹون کے لیے اپنی فلم 'الہلال' بنانے میں لگا ہوا تھا۔ انھوں نے ضیا کو اپنے پاس رکھ لیا۔

ضیا نے اپنی پہلی فلمی کہانی 'دکن کوئین' لکھی جو ایک اسٹنٹ فلم تھی جسے محبوب نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ سریندر اس کا ہیرو تھا۔ یہ فلم خوب چلی۔ اس کے بعد ضیا نے پوسٹ مین، بھولے بھالے اور یتیم فلموں کی ڈائرکشن دی مگر ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ ضیا کو ایک اچھا رائٹر اور مکالمہ نویس تو تسلیم کر لیا گیا مگر انھیں اچھا ہدایت کار نہیں مانا گیا۔ وہ دل برداشتہ تھے کہ ہدایت کار اور کیریکٹر ایکٹر مظہر خان نے جوہو والے مکان میں انھیں آسرا دیا۔ دونوں نے مل کر اپنی اگلی پروڈکشن کی تیاری شروع کر دی مگر یہاں بھی مقدر نے ساتھ نہ دیا اور مظہر خان کے اچانک انتقال سے وہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

بڑی محنت کے بعد آخر ضیا نے سوشلزم پر مبنی نئی طرز کی ایک کہانی لکھی۔ کے آصف کو یہ کہانی پسند آئی مگر انھوں نے کچھ تبدیلیوں کی مانگ کی، ضیا نے صاف انکار کر دیا۔ ان دنوں رنجیت موویٹون کے مالک سیٹھ چندولال شاہ کو ایک نئی کہانی کی ضرورت تھی۔ ضیا نے انھیں کہانی سنائی مگر ساتھ ہی دو شرطیں رکھیں کہ فلم کو میں ہی ڈائرکٹ کروں گا اور اسٹوری میں کسی قسم کی دخل اندازی یا تبدیلی برداشت نہیں کروں گا۔ سیٹھ جی تیار ہو گئے مگر اتنی بات منوالی کہ بجٹ زیادہ نہیں ہوگا۔ نوتن، بلراج ساہنی، شیاما، جمی اور انور حسین کو لے کر فلم 'ہم لوگ' کی شروعات ہو گئی۔ لوگ فلم دیکھ کر متاثر ہوئے اور اس کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ کمیونسٹ حلقوں نے خاص طور سے اس کی سراہنا کی اور بمبئی کی مزدور بستیوں کی جانب سے ضیا اور اس کے ساتھیوں کے اعزاز میں ایک شاندار عوامی اجتماع ہوا۔ پریس والوں نے تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ اس حوصلہ افزائی سے متاثر ہو کر رنجیت موویٹون نے ضیا سرحدی کے تحت فلم 'فٹ پاتھ' کا اعلان کر دیا جس میں کام کرنے کے لیے دلیپ کمار، مینا کماری، ماروتی اور رمیش تھاپر کو چنا گیا۔ میوزک کی ذمہ داری خیام کو سونپی گئی۔ سردار جعفری کے ایک دو گیت بھی اس میں تھے۔ یہ فلم بلیک مارکیٹ کے خلاف تھی مگر فیل ہو گئی۔ اس کے بعد محبوب نے ضیا سرحدی کو فلم 'پیسہ ہی پیسہ' میں چانس دیا مگر وہ بھی فلاپ ہو گئی۔ ضیا کا دل ٹوٹ گیا اور وہ مایوس ہو کر پاکستان چلا گیا۔

فلم انڈسٹری کے اوائل میں زبیدہ، سلوچنا، مادھوری، زیب النسا، گوہر اور ناڈیا کے نام بہت نمایاں تھے۔ گوہر پنجاب کی راجدھانی لاہور میں پیدا ہوئی۔ ایک مشہور اسٹیج ایکٹرس کی بیٹی تھی، پورا نام گوہر جان تھا۔ جب شہرت کی بلندیوں پر پہنچی تو رنجیت کی شہزادی کے لقب سے بھی معروف تھی۔ اردو شعر و ادب کی دلدادہ تھی اور حضرت اکبر الہ آبادی کا آٹوگراف لینے کے لیے ان کے ہاں گئی تھی۔ آرٹ اس کی رگوں میں سرایت کر گیا تھا۔ سب سے پہلے کرشنا پروڈکشنز کی پکچر Fortune and Fool میں کام کیا۔ 1933 میں مشہور ہیرو بھگوان داس کے ساتھ فلم 'بیرسٹر کی بیوی' میں نمودار ہوئی۔ یہ جوڑی مقبول ہوئی اور کئی فلموں میں ایک ساتھ آئی۔ رنجیت موویٹون کے مالک سیٹھ چندولال شاہ کے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

اردو دنیا

اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں
اردو اساتذہ کی تقرری کی جائے

گورکھپور (۱۳ جولائی)۔ اردو اکادمی اترپردیش کی کارکردگی اطمینان بخش ہے لیکن حکومت کی جانب سے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو اساتذہ کی تقرری نہ ہونا تشویشناک ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ساجد علی میموریل کمیٹی کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے محمد حامد علی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اساتذہ کے نہ ہونے کے سبب طلبہ کے سامنے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں جن کا فوری حل بے حد ضروری ہے۔

محبوب سعید حارث نے بتایا کہ دوبارہ یاد دہانی کراتے ہوئے اس معاملے میں وزیر اعلا کو خط ارسال کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ گورکھپور یونیورسٹی سے لے کر گورکھپور کے جبلی کالج اور دیگر اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری کا اعلان کیے جانے کے باوجود کارروائی میں پیش رفت نہیں ہورہی ہے۔ خط میں وزیر اعلا کو بتایا گیا کہ گورکھپور یونیورسٹی میں طلبہ کی تعداد اطمینان بخش ہے لیکن صرف ایک استاد درس دے رہے ہیں جب کہ بی اے کے درجات میں تقریباً ڈھائی سو طلبہ ہیں اور ایم اے کے درجات میں 160 طالب علم ہیں۔ ایسی حالت میں صرف ایک استاد کے ذریعے تعلیم دلانا ناممکن ہے، اس کے علاوہ ایک استاد ریسرچ اور دفتر کے کاموں کی ذمہ داری انجام دے رہے ہیں۔

خط میں تحریر کیا گیا ہے کہ جبلی کالج میں اردو ٹیچر کے سبکدوش ہونے کے بعد کسی دوسرے ٹیچر کی تقرری نہیں کی گئی ہے۔ مجبور ہو کر طلبہ کو دیگر مضمون کا انتخاب کرنا پڑ رہا ہے۔ خط میں وزیر اعلا سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس جانب فوری توجہ دیں۔ جلسے میں ایک تجویز کے ذریعے اکادمی کے ذمہ داران سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ بھی اپنی سطح سے صوبے میں اردو اساتذہ کی تقرری کے سلسلے میں حکومت سے رجوع کریں اور جلد اقدام کے لیے حکومت پر زور دیں۔ عمران بشر نے بتایا کہ مہراج گنج، سنت کبیر نگر، دیوریا وغیرہ کے سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری نہیں ہوئی اور سب کو تعلیم اسکیم کے تحت اردو کی کتابیں تقسیم نہیں کی جارہی ہیں۔ جلسے میں آصف سعید، حافظ عبدالرحمن اور تسلیم عالم وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(آگ۔ لکھنؤ)

تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے اردو اسکولوں میں اساتذہ کی کمی

حیدرآباد (یکم جولائی)۔ 2012-14 کے درمیان آندھرا پردیش اور تلنگانہ ریاستوں کے اردو میڈیم اسکولوں میں داخلہ لینے والے 80 ہزار طلبہ کو ان کی تعداد کی مناسبت سے اساتذہ کی کمی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ طلبہ کی تعداد کی مناسبت سے اساتذہ کی تعداد کو 'پیوپل ٹیچر ریشو' (پی ٹی آر) کہا جاتا ہے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ دونوں ریاستوں میں 2 ہزار 682 اردو میڈیم اسکول ہیں، ان میں سے 700 پرائمری اسکول ایسے ہیں جہاں 30 سے زائد طلبہ کو پڑھانے کے لیے صرف ایک ٹیچر ہے اور قابل ذکر ہے کہ یہ حق تعلیم کے مقرر کردہ اصولوں کے خلاف ہے۔ اسکولی تعلیم کے محکمے کے افسروں نے بتایا ہے کہ حق تعلیم کے قانون (آرٹی ای) میں درج پی ٹی آر کے مطابق پرائمری اسکولوں میں 30 طلبہ کے لیے ایک ٹیچر کا ہونا لازمی ہے جب کہ اپر پرائمری اسکولوں میں 35 اسٹوڈنٹس کے لیے ایک ٹیچر کی تقرری طے کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جن اسکولوں میں طلبہ کی تعداد 150 سے 200 تک ہے، ان میں ایک ہیڈ ماسٹر ہونا چاہیے جس کے ماتحت کام کرنے والے 5 اساتذہ ہوں گے۔

اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کے ذریعے ڈسٹرکٹ انفارمیشن سسٹم فور ایجوکیشن (ڈی آئی ایس ای) کے ڈیٹا کا تجزیہ کیے جانے پر معلوم ہوا ہے کہ 197 اسکولوں میں 30 سے کئی زیادہ طلبہ کے لیے صرف ایک ٹیچر ہے جن میں ضلع حیدرآباد سر فہرست ہے جب کہ اس کے بعد نظام آباد ضلع کا نمبر ہے جہاں 83 طلبہ کے لیے ایک ٹیچر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتیں اردو میڈیم اسکولوں میں بہتر نظم کی جانب توجہ نہیں دے رہی ہیں۔ عادل آباد ضلع میں 72 طلبہ کے لیے ایک ٹیچر ہے۔ کرنول ضلع میں 73 طلبہ کے لیے ایک ٹیچر ہے اور رنگا ریڈی میں ایک ٹیچر 64 طلبہ کو تعلیم دے رہا ہے۔ ایس آئی او کے سکریٹری فرحان سنبل نے بتایا کہ 'ڈی آئی ایس ای کے اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ مذکورہ اضلاع میں 1161 سیکنڈری گریڈ کے ٹیچروں کی ضرورت ہے جب کہ 705 معاون بھی درکار ہیں۔ آندھرا پردیش اور تلنگانہ کی حکومتوں سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ خالی اسامیوں کو جلد پورا کرنے کی کارروائی کریں۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو اساتذہ کے پروموشن کا مطالبہ

شاہ جہاں پور، یوپی (۲۲ جولائی)۔ جونیر ہائی اسکول شکشک سنگھ دودول شاخ کے بلاک سکریٹری محمد تحسین خاں نے بی ایس اے کو میمورنڈم دے کر دسمبر 1997 تک تعینات اساتذہ کا پروموشن جونیر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹروں کے خالی عہدوں پر کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ تین نکاتی میمورنڈم میں انھوں نے کہا ہے کہ اپریل 2015 تک صوبے میں آرٹی ای کو مکمل طور سے نافذ ہونا ہے جس کی بھی رسوم مابعد میں ہی مکمل ہو چکی ہیں۔ ضلع میں جونیر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹروں کے عہدے خالی ہیں اور اہل اساتذہ کے ہوتے ہوئے بھی ان عہدوں پر تقرری نہیں کی گئی جس کی وجہ سے اسکول کا نظم ہیڈ ماسٹر کے نہ ہونے کی صورت میں بگڑ گیا ہے۔ ایسی صورت میں حکومت اور محکمے کے ذریعے پروموشن کے لیے مقررہ مدت ختم ہونے سے قبل جونیر ہائی اسکولوں کے اہل اساتذہ کا پروموشن جونیر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹروں کے عہدوں پر فوراً کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ مارچ میں اردو اساتذہ کی تقرریاں کی گئی تھیں، ان اساتذہ کو اب تک تنخواہ نہیں دی گئی ہے جب کہ ڈائٹ سے تعلیمی اسناد کی تصدیق کی جاچکی تھی۔ انھوں نے کہا کہ دسمبر 2010 میں تعینات اردو اساتذہ اور مخصوص بی ٹی سی اساتذہ کے پروموشن ہونا باقی ہیں۔ پرائمری اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں اور جونیر ہائی اسکولوں کے معاون اساتذہ کے عہدے بڑی تعداد میں خالی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اساتذہ کی اسامیوں پر تقرری کی یقین دہانی

حیدرآباد، آندھرا پردیش (۱۳ جولائی)۔ ضلع عادل آباد کے ایجنسی علاقے میں کئی دنوں سے اردو میڈیم اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقرری کے متعلق کا بینہ میں اس مسئلے کو پیش کرنے کا ریاستی وزیر جنگلات و ماحولیات نے تیقن دیا۔ انھوں نے آصف آباد سے ایک پروگرام میں شرکت کے بعد واپسی کے دوران بجنور میں توقف کیا تھا۔ اس موقعے پر ایم اے آزاد یوتھ ایسوسی ایشن اور ویلفیئر سوسائٹی کے صدر سید اسد علی نے خصوصی ملاقات کر کے اردو والوں کے مسائل سے ریاستی وزیر کو واقف کروایا اور ایک یادداشت پیش کی۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

نئے درسی کتب کے تعلق سے کانفرنس اردو میں منعقد کرنے کے لیے نمائندگی

حیدرآباد (۱۱ جولائی)۔ اردو میڈیم نویں اور دسویں جماعت کے لیے درسی کتب کے تعلق سے ٹیلی کانفرنس اردو میں رکھنے کے سلسلے میں ایس سی ای آر ٹی کے ڈائرکٹر جناب ایس جگن ناتھ ریڈی سے حیدرآباد ضلع کے اردو میڈیم مدارس کے صدور اور کئی اساتذہ نے نمائندگی کی جس پر ایس سی ای آر ٹی کے ڈائرکٹر نے فوری اردو میڈیم اساتذہ کے لیے ٹیلی کانفرنس اور ماڈیولس جاری کرنے کا تیقن دیا کیوں کہ دسویں جماعت میں نئے جانچ کے طریقے اور ماڈیولس صرف تلگو میں ہوتے ہیں جن سے اساتذہ کو دشواری کا سامنا تھا۔ اس وفد میں جناب خواجہ نظام الدین، سید عبدالعظیم ساجد، ایم اے قدیر خاں، محمد مقبول احمد اور مقبل القادری شامل تھے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

مشاہیر ادب سے گزارش

میں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے خطوط مرتب کر رہا ہوں۔ جن ادیبوں اور شاعروں کے پاس اثر صاحب کے خطوط ہوں وہ ان کی نقل یا اصل درج ذیل پتے پر بھیجنے کی زحمت گوارہ کریں۔

اس کام کے لیے جو اخراجات ہوں گے وہ میں برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جو حضرات اصل خطوط روانہ کریں گے میں ان کے خطوط زیروکس کروانے کے بعد بہ حفاظت واپس کر دوں گا۔

Dr. Daljeet Veram
D-53, Bharat Nagar
Talab Tillo, Jammu-180002
Mobile No. 09419150556

حیدر علی نگر کا اردو اسکول بنیادی سہولتوں سے محروم

چناپٹنی، کرناٹک (یکم جولائی)۔ چناپٹنی تعلقہ میں لسانی اقلیت کی آبادی اچھی خاصی ہے، اس کے باوجود چناپٹنی حلقے کے مختلف اردو اسکولوں کو پچھلے کئی برسوں سے بنیادی سہولتوں سے محروم رکھا گیا ہے۔ محکمۂ تعلیمات کے افسران اور مقامی سیاسی لیڈران اردو اسکول کی طرف غور و فکر نہیں کر رہے ہیں۔ حکومت سرکاری اسکولوں کو بنیادی سہولت فراہم کرنے کے لیے کافی فنڈ جاری کر رہی ہے لیکن چکبالاپور ضلع چناپٹنی تعلقہ کے اس سرکاری اسکول کو بنیادی سہولت فراہم کرنے میں کیوں کوتاہی اور لاپرواہی کی جارہی ہے، معلوم نہیں؟ حیدر علی نگر میں ۲۶ جولائی ۱۹۹۸ء کو اس وقت کے چناپٹنی حلقے کے رکن اسمبلی کے ایم کرشنا ریڈی نے سرکاری اردو اسکول کا سنگ بنیاد رکھا پھر چند ہی مہینوں بعد سرکاری اردو اسکول کی عمارت تعمیر کر کے افتتاح کیا گیا۔ اس اسکول میں جملہ چار کمرے ہیں۔ اب سرکاری اردو اسکول میں پہلی جماعت میں 10 طلبہ، دوسری جماعت میں 16، تیسری جماعت میں 12، چوتھی میں 15، پانچویں جماعت میں 15، جملہ 70 طلبہ و طالبات ہیں اور جن کو تعلیم دینے کے لیے ہیڈ معلم کے علاوہ تین اساتذہ ہیں۔ اسکول کے کمرے چھوٹے ہونے سے طلبہ و طالبات کو تعلیم حاصل کرنے میں پریشانی ہو رہی ہے۔ اس اسکول کی ہیڈ معلمہ عبدالنساء نے نامہ نگار محمد اعظم کو بتایا کہ ہمارے اسکول میں طلبہ،

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

'ہماری زبان' کا ہر شمارہ میرے ریڈنگ روم کے وقار میں اضافہ کرتا ہے

مکرمی! ہفت روزہ 'ہماری زبان' کا ہر شمارہ نہ صرف میرے ریڈنگ روم کے وقار میں اضافہ کرتا ہے بلکہ مجھ جیسے شعر و ادب کے طالب علم کے لیے سیرابی ذوق کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ گزشتہ شمارے ۸ تا ۱۴ جون ۲۰۱۲ء میں شائع ہونے مضامین 'محسنات شعر' (عابد علی عابد)، 'تجھ کو ناگی - آزاد بگرامی' (رؤف خیر) اور 'ایک خوب صورت زندگی کا المناک انجام' (شفاعت احمد طاؤسی) انتہائی عمدہ مضامین ہیں۔ بہ طور خاص 'محسنات شعر: مناہج و بدائع' تو حاصل شمارہ مضمون ہے۔ علاوہ ازیں نئی کتابوں پر تبصرے اور 'اردو دنیا' کالم ہمیں اردو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی اہم خبر سے متعارف کراتا ہے۔ خدا کرے 'ہماری زبان' اور آپ کی کامرانیوں کا یہ سفر یوں ہی جاری رہے۔

محب الرحمٰن وفا
بودوڑ، دیاپور
امراوتی 444708 مہاراشٹر

سرکاری اردو پرائمری اسکول میں غریب طلبہ کے ساتھ مذاق

موڈ گیرے، کرناٹک (۱۳ر جولائی)۔ یہاں کے سرکاری اردو پرائمری اسکول میں ایک معلمہ کی جانب سے بچوں کے اسکالر شپ فارمس اور دیگر دستاویزات کو پھاڑ کر خود بچوں کے ہاتھ گھر واپس لوٹانے کا واقعہ پیش آیا ہے۔ اطلاع کے مطابق موڈ گیرے ٹاؤن سے ہاسن روڈ ایکسٹینشن کے قریب توفیق نامی شخص رہتے ہیں، جن کے بچے نفیسہ پانچویں جماعت، شفا اور ایان تیسری جماعت میں زیر تعلیم ہیں۔ انتہائی غربت میں زندگی گزارنے والے توفیق نے اپنے بچوں کا اسکالر شپ حاصل کرنے کے لیے گزشتہ ایک ہفتے تک اپنا کام چھوڑ کر مختلف سرکاری دفاتر کا چکر کاٹ کر دستاویزات تیار کیے اور اسکالر شپ کے لیے عرضیاں داخل کیں۔ توفیق نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ گھر واپس آنے کے بعد بچوں کے ہاتھ اسکالر شپ فارم اور دستاویزات پھٹے ہوئے تھے۔ بچوں نے بتایا کہ ایک معلمہ نے انھیں ڈانٹا اور دستاویزات پھاڑ کر ان کے ہاتھ میں دے کر روانہ کیا۔ توفیق فوراً اپنے بچوں کو لے کر بی ای او دفتر پہنچے لیکن دوسرا ہفتہ ہونے کی وجہ سے دفتر کی چھٹی تھی۔ توفیق نے اپنے بچوں کو میڈیا کے روبرو کیا اور بتایا کہ غریبی کے باوجود بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے مقصد سے ایک ہفتے تک دوڑ دھوپ کرکے افیڈیوٹ و دیگر دستاویزات تیار کیں لیکن معلمہ نے انھیں واپس روانہ کردیا۔ معصوم بچوں کو پھٹے ہوئے دستاویزات کے ساتھ دیکھ کر مقامی عوام نے بی ای او سے مطالبہ کیا کہ اس معلمہ کے خلاف سخت کارروائی کریں اور ان بچوں کے لیے فوراً اسکالر شپ منظور کروائیں۔ (سالار، بنگلور)

طالبات کے لیے ابھی تک یونیفارم اور کتابیں نہیں دی گئی ہیں جس سے بچوں کی تعلیم کا کافی نقصان ہو رہا ہے۔ کئی مرتبہ افسران سے شکایت کی گئی لیکن وہ غور ہی نہیں کر رہے ہیں۔ اسکول میں پانی کی بہت زیادہ قلت ہے۔ حال ہی میں اس وارڈ کے کونسلر نے پانی کی قلت سے نمٹنے کا یقین دیا تھا لیکن ابھی تک پانی کا مسئلہ حل نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے محکمہ تعلیمات کے افسران کو چاہیے کہ وہ اس اسکول کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے کوئی حل نکالیں۔ (سالار، بنگلور)

اردو اساتذہ کے تقرر کا مطالبہ

جگتیال، آندھرا پردیش (یکم جولائی)۔ جگتیال حلقے کے پانچ منڈلوں مدنور، جگتیال، ملیال، رائیکل، ساگر، پگلٹہ میں اردو اسکولوں میں اردو کے ٹیچرس نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ و طالبات کو اردو کی تعلیم کے حصول میں مشکلات ہو رہی ہیں۔ تفصیلات کے مطابق جگتیال حلقے کے پسماندہ علاقہ ہونے کے باوجود اردو اساتذہ کی تقرری کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر مسٹر ایس سرینواس چاری سے نمائندگی کرنے کے باوجود آج تک بھی اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں ہوا۔ وزیر اعلا اور محکمہ تعلیم سے اپیل ہے کہ اردو زبان کے اساتذہ اور اردو میڈیم سے دوسرے مضامین پڑھانے والے اساتذہ کا فوری تقرر کرکے عوام اردو کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ (سیاست، حیدرآباد)

گیارہویں اور بارہویں اردو میڈیم کی نصابی کتابوں کی عدم فراہمی پر حکومت مہاراشٹر کو تین ہفتے میں جواب داخل کرنے کی ہائی کورٹ کی ہدایت

ممبئی۔ گیارہویں اور بارہویں اردو میڈیم نصابی کتابوں کی عدم فراہمی کے سبب مہاراشٹر حکومت کو ممبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بنچ نے وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا ہے۔ طلبہ تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا، ساؤتھ مہاراشٹر کی جانب سے مفاد عامہ کے تحت داخل کی گئی عرضی داشت کے جواب میں عدالت نے یہ نوٹس جاری کیا ہے۔ اس نوٹس کے ذریعے عدالت نے ریاستی حکومت کو تین ہفتے میں تحریری طور پر اپنا جواب داخل کرنے کی ہدایت دی ہے۔ مہاراشٹر میں گیارہویں اور بارہویں اردو میڈیم کے طلبہ کو ریاستی حکومت کے متعصبانہ رویے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ریاستی حکومت کے محکمہ تعلیمات نے مراٹھی اور انگریزی میڈیم کے طلبہ کو نصابی کتابیں مہیا کی ہیں لیکن اردو میڈیم کے طلبہ کو اب تک کتابیں مہیا نہیں کی گئی ہیں۔ اردو میڈیم کی نصابی کتابیں مہیا نہیں کیے جانے سے پریشان حال طلبہ کے مستقبل کو نظر میں رکھتے ہوئے طلبہ تنظیم کے ذمہ داران نے ممبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بنچ میں مفاد عامہ کے تحت عرضی داشت داخل کی۔ ایس آئی او کی درخواست پر عدالت نے ریاستی حکومت کو وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا ہے۔

واضح رہے کہ MSBSHSE کی جانب سے صرف مراٹھی اور انگریزی میڈیم کے گیارہویں اور بارہویں کے طلبہ کے لیے نصابی کتابیں شائع کی جاتی ہیں اور اردو میڈیم کے طلبہ کو نجی پبلشرز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ معیاری نصابی کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے ریاست کے 363 اردو میڈیم جونیئر کالجوں کے ہزاروں طلبہ اپنی جماعت کے تمام مضامین جس میں کیمیات، طبعیات، حیاتیات، سماجیات، سیاست، جغرافیہ، تاریخ، معاشیات وغیرہ شامل ہیں، کے لیے دیگر زبانوں کی کتابیں یا کم معیاری کتابوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔ (سیرت، ممبئی)

سات ماہ سے تنخواہ نہ ملنے سے اردو اساتذہ پریشان

خورجہ (۱۶ر جولائی)۔ اترپردیش میں بہ طور اردو ٹیچر تقرر ہونے والے کئی حضرات سات ماہ سے تنخواہ نہیں ملنے پر پریشان ہیں۔ رمضان المبارک اور عید کے پیش نظر مذکورہ اردو اساتذہ کو مشکلات کا سامنا ہے۔ افسران نے تعلیمی قابلیت اور اسناد کی تصدیق نہیں ہونے کی بات کہہ کر اردو اساتذہ کے مسائل سے چشم پوشی کر رکھی ہے۔ ادھر ضلع کے تقریباً 61 اساتذہ نے آئندہ ایک ہفتے میں تنخواہیں نہیں ملنے پر تحریک چلانے نیز وزیر اعلا سے ملاقات کرکے افسران کی شکایت کرنے کا انتباہ دیا ہے۔ واضح رہے کہ صوبے میں سماج وادی پارٹی کی حکومت کی تشکیل کے بعد ہی صوبے کے بے روزگار اردو معلمین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حکومت نے ۱۹۹۷ء سے قبل کے معلم اردو پاس بے روزگاروں کو بہ طور اردو اساتذہ تقرر نامہ دینے کا عمل جاری کردیا، جس کے تحت بلند شہر ضلع میں 61 افراد کو منتخب کیا گیا۔ انھیں جنوری میں دور دراز مواضعات میں غیر اردو داں حلقوں میں تعینات کیا گیا۔ مذکورہ اردو اساتذہ ذمہ داری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں مگر سات ماہ گزرنے کو ہیں پھر بھی انھیں ایک ماہ کی بھی تنخواہ نہیں دی گئی۔ بار بار بی ایس اے اور دیگر افسران سے ملاقات کرنے پر ایک ہی جواب دیا گیا کہ ابھی تعلیمی قابلیت اور اسناد کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ جب کہ کونسلنگ کا عمل گزشتہ سال اکتوبر نومبر میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ ۹ ماہ گزرنے کے بعد بھی آج تک تصدیق نہیں کرانا اردو اور اردو اساتذہ کے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بھی الزام ہے کہ کچھ اساتذہ کا بل بھی بن گیا ہے مگر لیکھا دھیکاری (ٹریژرار) کے آئندہ ۱۸ جولائی تک تعطیل پر ہونے کے سبب ان اساتذہ کی تنخواہ بھی نہیں مل پائی ہے۔ انچارج ٹریژرار نے اساتذہ کے بلوں پر دستخط کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس طرح عید سے قبل تنخواہ ملنے کی امید پر پانی پھرتا نظر آرہا ہے۔ اس بابت اردو اساتذہ شمس الدین، رہبر رضا، نظمی، منور علی، پرویز خان، کمل سنگھ یادو، اختر خان، محمد منصور، شگفتہ اور رضوان وغیرہ نے بتایا کہ ۷ ماہ سے تنخواہ نہیں ملنے سے ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو اساتذہ کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ کئی ٹیچروں نے بتایا کہ یوپی حکومت نے بہت جلد اگر کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تو اردو اساتذہ تحریک چلانے پر مجبور ہوں گے۔ انھوں نے بہت جلد بلند شہر میں ایک میٹنگ کرکے سہ رکنی وفد کو وزیر اعلا اکھلیش یادو سے ملاقات کرکے اردو اساتذہ کے مسائل سے واقف کرانے کی بات کہی ہے۔ (اردو ایکشن، بھوپال)

ہیرو گنگولی کالج میں پوسٹ گریجویشن اور ہیرالال کالج میں اردو مضمون شروع

کلکتہ (۱۹ر جولائی)۔ مغربی بنگال اقلیتی کمیشن کے چیئرمین الحاج علی شاہ کی جانب سے ریاست کے 20 طلبہ و طالبات کو دھیانک، ہائی مدرسہ، سینئر مدرسہ، ہائر سیکنڈری، میڈیکل اور انجینئرنگ میں نمایاں مارکس حاصل کرنے پر وظیفے دیے جانے کے عمل کی ریاستی وزیر برائے اقلیتی امور غیاث الدین ملا اور اسپورٹس اور جیل کے وزیر مدن مترا اور جاوید احمد خان نے زبردست ستائش کی۔ واضح ہو کہ سال گزشتہ کی طرح امسال بھی مختلف زمرے میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو فی کس 1000 روپے اور ایک سند دیا گیا۔ اس موقع پر کمیشن کے کانفرنس روم میں ایک جلسہ تقسیم وظیفہ کا اہتمام کیا گیا جس میں متذکرہ ریاستی وزرا کے علاوہ وقف بورڈ کے چیئرمین حاجی محمد عبدالغنی اور مدرسہ بورڈ کے صدر فضل ربی نے بھی شرکت کی۔ غیاث الدین ملا نے کہا کہ وظیفے کی رقم چھوٹی ہو یا بڑی یہ کوئی معنی نہیں رکھتی ہے، بڑی بات یہ ہے کہ سب کچھ آپ کی حوصلہ افزائی کے لیے ہے۔ آپ نے اچھا کیا ہے، اس لیے آپ کو پذیرائی مل رہی ہے۔

مدن مترا نے کہا کہ اعلا تعلیم کے حصول میں جس کسی کو بھی کوئی پریشانی ہو وہ براہ راست ان سے ملیں۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اقلیتی طلبہ و طالبات کے لیے ہیرو گنگولی کالج میں پوسٹ گریجویشن اور ہیرالال کالج میں اپنی ذاتی کوششوں سے اردو مضمون شروع کرایا ہے۔ میں نے منتظمین کو تاکید کی ہے کہ وہ اقلیتی طالب علموں کی صد فیصد فیس معاف کردیں۔

جاوید احمد خان نے کہا کہ سچے دل سے سوچنے سے ہر کام ہوتا ہے۔ الحاج علی شاہ ہر سال ایسی کوشش کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اس موقع پر دھیانک کے 5، ہائی مدرسہ کے 2، سینئر مدرسہ کے 2، ہائی سیکنڈری کے 5، میڈیکل کے 2 جب کہ انجینئرنگ کے 4 طالب علموں کو وظیفے دیے گئے۔ (اخبار مشرق، کلکتہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : پیکرِ جہد و عمل
مفتی عطائی (تحقیق، تبصرہ)
مصنف : ڈاکٹر محبوب راہی
ضخامت : ۹۶ صفحات
قیمت : ۱۰۰؍روپے
تقسیم کار : اسباق پبلی کیشنز
لوہگاؤں روڈ، پونہ، مہاراشٹر
تبصرہ نگار : ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی

کثیر التصانیف شاعر، ادیب اور معروف نقاد ڈاکٹر محبوب راہی کے قلم بے ثقافت کے کارنامے جاری و ساری ہیں جس کی روشن مثال سالِ رواں ۲۰۱۴ء کی دوسری تحقیقی و تنقیدی تصنیف 'پیکرِ جہد و عمل: غنی غازی' ہے۔ غنی غازی ایک ہمہ جہت شخصیت ہے جن کے صحافتی، سیاسی، سماجی، تعلیمی، ادبی اور تہذیبی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ بچوں کی کہانیوں پر مشتمل ان کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، اسی طرح صحافت میں غنی غازی نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ صحافتی دور میں کالم نگاری اور ادارت کے اہم فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ ان تمام کارناموں کے متعلق ڈاکٹر محبوب راہی نے ایک موثر مقالہ تحریر کرکے غنی غازی کی حوصلہ افزائی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ڈاکٹر محبوب راہی نے 'پیکرِ جہد و عمل: غنی غازی' (جس کو جانا ہے بہت اونچا بہ پرواز سے) عنوان کے تحت طویل مقالہ تحریر فرما کر اسے کتابی صورت میں پیش کیا۔ جس میں مثالی استاد، باخبر صحافی، باشعور ادیب، کامیاب کلشن نگار، کامل مترجم، مقبول عالم شاعر، شعلہ بیاں مقرر، باصلاحیت منتظم اور متحرک سماجی کارکن کے سیاسی شعور اور فہم و تدبر کی مثالیں، بڑے سیاسی قائدین نیز صوبائی و مرکزی وزرا سے غنی غازی کے قریبی مراسم کے حوالوں سے پیش کیا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر محبوب راہی "غنی غازی کی ہمالیائی رفعتوں کی حامل بلند مرتبت علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات تک رسائی محض خوشامد، چاپلوسی، جی حضوری، چمچہ گیری اور سفارش جیسی بیساکھیوں کے سہارے ممکن کر حاصل نہیں کی گئی، اس کی اپنی ذاتی صلاحیت، ذہانت اور قابلیت کا ثمرہ تھی"۔ کتاب میں غنی غازی کی چند تخلیقات 'علامہ اقبال اور ہندوستان'، 'ماں کی نصیحت'، 'حسنِ سلوک' اور 'شبنم کے موتی' کو شامل کیا گیا ہے نیز غنی غازی کی تخلیقات پر چند ثقہ اربابِ نقد و بصیرت کی طویل و مختصر آرا شامل ہیں۔ روایت چلی آرہی ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے متعلق خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اس کتاب کی انفرادیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ برخلاف روایت ایک استاد نے شاگرد کے حالاتِ زندگی، اس کی جد و جہد اور نمایاں کارناموں کو ایک دستاویز کی شکل دی ہے۔ غالباً اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اس لحاظ سے یہ پہلی انوکھی مثال ہوگی۔

کتاب کے ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا 'گفتہ باہمی' کے تحت طویل پیش لفظ شامل ہے۔ انتساب ڈاکٹر محبوب راہی نے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک شاگردوں کے نام کیا ہے۔ ۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں غنی غازی کی مختلف موقعوں کی عکاسی و یادگار تصاویر کتاب کی زینت و وقار کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ راہی صاحب چوں کہ غنی غازی کے ہر قری درجات ہی سے استاد رہے ہیں، اس لیے انھوں نے قدم بہ قدم غنی غازی کو نہایت عزم، حوصلے اور استقلال کے ساتھ محنت و اخلاص کی ابتدائی تاریکیوں سے گزرتے ہوئے کام یابی نصرت و کامرانی کی تابناک منزلوں کی جانب پیش رفت کرتے ہوئے آج کی شہرت و نیک نامی کی قابلِ رشک بلندیوں پر انھیں دیکھ رہے ہیں۔ غنی غازی کی ان پستیوں سے بلندیوں تک کے تمام تر سفر کی روداد راہی صاحب نے نہایت دل پذیر اور دل کش انداز میں تحریر فرمائی ہے جسے پڑھ کر ہر بچے اور نوجوان اپنی موجودہ پستیوں سے بلندیوں کو چھونے کی ہر ممکن کوشش کرسکتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ کرنا اور یہ مشاہرتو جوان کے لیے لازمہ عمل قرار دیا جاسکتا ہے۔

●●

بقیہ: فلمی دنیا کے رازہائے سربستہ

صفحہ ۳ سے آگے

ساتھ ملاقات ہوئی تو اسی کی ہوگئی۔ رنجیت کی متعدد فلموں میں کام کیا، بعد ازاں چندو لال شاہ کے ساتھ شادی کرکے رنجیت اسٹوڈیو کی مالکن بھی بن گئی۔ وہ سن 1932 کی حسین ترین اداکارہ تسلیم کی گئی۔

رنجیت موی ٹون تیز رفتاری سے فلمیں تیار کرتی تھی۔ اس کی چھ چھ آٹھ آٹھ فلمیں ظہور پزیر رہتی تھیں، ہر دو ماہ بعد اس کی فلم مارکیٹ میں آجاتی تھی اس لیے اس ادارے کو فلمیں بنانے والی فیکٹری کہا جاتا تھا۔ اچھی فلمیں کم تیار ہوتی تھیں، لچر اور واہیات فلمیں زیادہ۔ رنجیت کا ٹریڈ مارک گھوڑا تھا اور یہ سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ میاں بیوی دونوں ریس کے شوقین تھے اور انھوں نے کئی گھوڑے پال رکھے تھے۔ ریس کے میدان میں جاتے تو بڑی بڑی رقمیں جیتتے یا ہارتے۔ ایکٹرس کی حیثیت سے گوہر نے گن سندری، راج ماری، ویشا اور اچھوت میں کام کرکے اپنے نام کی دھاک جما دی۔ اس کے بعد جسم موٹاپے کی جانب مائل ہوگیا تو ایکٹنگ بند کردی اور ساری توجہ اسٹوڈیو کی طرف لگادی۔

قسمت پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ تقسیم وطن کے بعد رنجیت موی ٹون کی فلمیں دھڑا دھڑ فلاپ ہونے لگیں۔ اس نے جوگن، ہم لوگ اور فٹ پاتھ جیسی معیاری فلمیں بھی تیار کیں مگر وہ باکس آفس پر کوئی کرشمہ نہ دکھا سکیں۔ ادھر ریس میں ان کے گھوڑے بھی پٹنے لگے۔ سیٹھ چندو لال شاہ نے آخری داؤ لگایا۔ بڑا کاری ہدایت کار کو لے کر فلم 'ذکیل مت جانیو' بنائی۔ ہدایت کار سیٹھ جی خود تھے۔ اپنے پرانے مقبول ایکٹر چارلی کو پاکستان سے بلاکر بچوں کے لیے ایک فلم 'زمین کے تارے' تیار کی۔ دونوں فلمیں فلاپ ہوگئیں۔ کمپنی مقروض ہوگئی۔ قرضہ اتارنے کے لیے رنجیت اسٹوڈیو فروخت کردیا گیا۔ ریس کے گھوڑے بھی بک گئے۔ چندو لال شاہ اور گوہر سڑک پر آگئے۔ فلم انڈسٹری کے سبھی دوستوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ عسرت کی زندگی گزارنے لگے اور گمنام ہوگئے۔ دونوں نے مفلسی کے عالم میں دم توڑا۔

ایک زمانے میں اداکارہ مہتاب کا نام اخبارات میں جلی حروف میں لکھا جاتا تھا کیوں کہ اُس کی موجودگی فلم کی کامیابی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ وہ خوب صورت تھی اور باصلاحیت بھی۔ 1918 میں بمبئی میں اس کی پیدائش ہوئی۔ نجمہ اس کا حقیقی نام تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں ہی اُس نے اداکاری کا پیشہ اختیار کرلیا۔ ہیروئن کے طور پر اس کی اولین پکچر 'کمال شمشیر' تھی۔ 'تھدی'، 'اجنگٹ کنیز'، 'افتخار' اس کی دیگر مشہور پکچریں تھیں۔ اس نے رنجیت موی ٹون، پرکاش پکچرز، فلم کارپوریشن، ہوپی فلمز کی بے شمار فلموں میں کام کیا۔ اے آر کاردار نے بھی اسے دو فلموں 'شاردا' اور 'جوگ' کے لیے منتخب کیا لیکن 'چندر لیکھا' اس کی شاہکار فلم تھی جو بھگوتی چرن ورما کے ایک مشہور ناول پر بنی تھی۔ یہ بدھ بادشاہوں کے دور کی ایک درباری رقاصہ کی داستان تھی جسے ہدایت کار کیدار شرما نے بڑے اچھے ڈھنگ سے فلمایا تھا۔ اس کی موسیقی کلاسیکل راگ راگنیوں پر مبنی تھی پھر بھی عوام نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ خاص طور سے یہ نغمہ بہت مقبول ہوا تھا:

سُن سُن نیل کمل مسکائے
بھنورا رس چوسے اُڑ جائے

فلم 'چترلیکھا' کا چرچا پریس میں اس لیے بہت ہوا کہ اس کے ایک منظر میں مہتاب نے غسل کے عریاں منظر میں حصہ لیا تھا۔ ڈائرکٹر کیدار شرما نے یہ منظر بڑی چابک دستی سے فلمایا تھا اور یہ چند ہی سیکنڈ کا تھا۔ قدامت پسند لوگوں نے اس کے خلاف بڑا واویلا مچایا اور اسے کاٹ دینے کا مطالبہ کیا۔ ہدایت کار نے یہ موقف لیا کہ یہ منظر کہانی کا ایک اہم حصہ ہے اور اسے حذف کردینے سے فلم کا تسلسل بگڑ جائے گا۔ سنسر بورڈ نے یہ سین جوں کا توں پاس کردیا۔

اس کے بعد مہتاب نے سہراب مودی ٹون کو جوائن کرلیا اور اس کی فلموں 'ساتھی'، 'ایک دن کا سلطان' اور 'شمع' میں کام کیا لیکن یہ نمایاں کامیابی نہ حاصل کرسکیں اور مہتاب یس پردہ چلی گئی۔ 'شمع' کی شوٹنگ کے دوران وہ پروڈیوسر سہراب مودی کے بہت قریب آگئی اور دونوں کی شادی ہوگئی۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں سہراب مودی نے رنگین تاریخی فلم 'جھانسی کی رانی' بنانے کا اعلان کیا جس کا بجٹ آٹھ لاکھ روپے تھا۔ مودی کا ارادہ تھا کہ مہتاب کو ہیروئن بنانے کا تھا کیوں کہ وہ رول کے عین فٹ بیٹھتی تھی لیکن بیوی باضد تھی کہ وہی ہیروئن بنے گی۔ مودی کو بیوی کی بات ماننی پڑی۔ مہتاب نے ورزش کرکے جسم کو کچھ بہتر بنایا مگر فلم فلاپ ہوگئی۔ تماشائیوں نے مہتاب کو جھانسی کی رانی کے کردار میں پسند نہیں کیا۔

سادھنا بوس ایک باکمال رقاصہ تھی اور آرٹ اس کی رگوں میں سمایا ہوا تھا۔ وہ برہمو سماج کے بانی کیشپ چندرا سین کی پوتی تھی۔ ہندوستان کے لاکھوں لوگ برہمو سماج مسلک کے پیروکار تھے۔ سادھنا کے خیالات ترقی پسندانہ تھے اور وہ سماجی بندھنوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ 16 برس کی عمر میں ہی اس نے مدھو بوس سے شادی کرلی۔ اپنے شوہر کی ڈائرکٹ کردہ فلم 'علی بابا' میں اس نے ہیروئن کا رول ادا کیا اور اس فلم کی کامیابی سے وہ شہرت کے آسمان پر پہنچ گئی۔ شکل و صورت کی زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن رقص میں مہارت کے باعث چل نکلی تھی، اداکاری بھی اچھی کرلیتی تھی۔ اس کی فلم 'کم دی ڈانسر' مقبول ہوئی تھی لیکن 'راج نرتکی' اس کے فن کی معراج تھی۔ اس میں ماضی کے کئی تاریخی پیش کیے گئے تھے۔ 'راج نرتکی' اردو انگریزی اور بنگالی زبانوں میں بھی تیار ہوئی تھی۔ انگریزی جب مغربی ممالک میں دکھایا گیا تو گوری چمڑی والے بھارتی فن رقص کے قائل ہوگئے۔ سادھنا بوس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ کئی غیرملکی اخبارات و رسائل میں اس کے انٹرویو شائع ہوئے۔ ڈانس کے مختلف اینگلوں کے ساتھ اس کے پوز پریس میں چھاپے گئے۔ پھر تک ایک نامور فن رقاصہ کا گروپ وہ بن گیا۔ کئی بڑے شہروں میں اس کے ڈانسنگ شو آراستہ کیے گئے۔ اس نے اپنے فن کی نمائش کے لیے باقاعدہ ایک ٹیم بنائی ہوئی تھی جو طے شدہ ضابطوں کے تحت کام کرتی تھی۔ اسی نظم و ضبط کے باعث اس کی ڈانسنگ پارٹی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔

تقدیر ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ 1947 میں چند اختلافات کے باعث اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرلی۔ دونوں میاں بیوی جس جوش و خروش کے ساتھ صنعتِ فلم سازی سے وابستہ ہوئے تھے اتنی ہی خاموشی کے ساتھ گمنامی کی

تاریکی میں کھو گئے۔ سادھنا بوس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں سڑکوں پر پھرنے لگی اور کئی جگہ بھکارن کی مانند دیکھی گئی۔ اسے جاننے اور پہچاننے والے لوگ کم ہی رہ گئے۔ وہ سادھنا جس کے ڈانس شو ملک بھر میں خوب دھوم سے ہوا کرتے تھے اور منتظمین کی جانب سے سووینیر خوب صورت انداز میں طبع ہوتے تھے، ٹکٹ مہنگے داموں بکا کرتے تھے، وہ اب سودائی ہو چکی تھی۔ ایک گمنام موت اس کے حصے میں آئی۔ ملک کے بٹوارے سے قبل اس کا ایک اسٹیج شو راقم نے لاہور کے ریگل سینما میں دیکھا تھا۔ ہال کے باہر لوگوں کی بھیڑ جمع تھی جن میں سے اکثر ٹکٹ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے مایوس نظر آرہے تھے۔ بلیک میں ٹکٹ چار گنا داموں میں بک رہے تھے۔

ناطق فلموں کے ابتدائی دور کی ہیروئن رتن بائی کا اصلی نام امام باندی تھا۔ 1912 میں بہار کی راجدھانی پٹنہ میں پیدا ہوئی۔ 'صبح کا ستارہ' اس کی پہلی فلم تھی۔ اس کے بعد نیو تھیٹرز لمیٹڈ کلکتہ اور رنجیت موویٹون بمبئی کی متعدد فلموں میں کام کر کے خوب نام کمایا اور ڈھیر ساری دولت جمع کی۔ نیو تھیٹرز کی 'یہودی کی لڑکی' میں غضب کی ایکٹنگ کی۔ اس کے بعد اسی ادارے کی فلموں 'راج رانی میرا' اور 'کاروانِ حیات' میں ہیروئن کی حیثیت سے پیش ہوئی۔ زیادہ رقم کمانے کی غرض سے بمبئی منتقل ہو گئی اور بڑے اچھے مشاہرے پر امپیریل کمپنی میں کام کرنے لگی۔ اس کمپنی کی کتنی ہی فلموں میں کام کیا جن میں سرلا، قیدی کی بیوی، ستارہ اور اجالا قابلِ ذکر ہیں۔ رنجیت موویٹون کی کئی پکچروں میں بھی نمودار ہوئی۔ یہ ایکٹرس اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے مقبول ہوئی جو اس کے ٹخنوں کو چھوتے تھے۔ سر کو ذرا سی بھی جنبش دائیں بائیں دیتی تو بال زمین کو چھونے لگتے تھے۔ اسی وجہ سے اسے رنجیت کا جھاڑو بھی کہا جاتا تھا۔ رنجیت سے الگ ہو کر اپنی ذاتی کمپنی قائم کی اور دو فلمیں 'بیلی' اور 'داسی' تیار کیں مگر وہ بری طرح فلاپ ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ گمنامی اور پستی کے غار کی طرف بڑھنے لگی اور بالآخر گمنام ہو گئی۔

اس کی فلموں کو دیکھ دیکھ کر ہندوستان کی ایک بڑی ریاست کا ولی عہد اس پر مرمٹا تھا۔ وہ اسے حسین ترین ملکہ تصور کرتا تھا اور دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ اسے اپنی ملکہ بنائے گا۔ وہ اپنے مصاحب کے ساتھ اس سے ملنے کے لیے بمبئی پہنچا تو پتا چلا کہ وہ قریب ہی کسی مقام پر آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے گئی ہوئی ہے۔ تلاش کرتے کرتے اس کے خیمے تک پہنچ گیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ رتن بائی باہر آئی تو شہزادہ اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس کا رنگ سانولا تھا، بال لمبے ضرور تھے مگر ان میں چمک دمک غائب تھی، دانتوں پر پیلا پن چھایا ہوا تھا۔ ہوش اڑ گئے اور واپس لوٹ آیا۔ اس کے بعد کسی ایکٹرس سے شادی کر کے ملکہ بنانے کا منصوبہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔ ایسے کئی راجکمار، ولی عہد اور رئیس زادے پردے پر ان جوان ایکٹرسوں کے جلوے دیکھ ان پر فدا ہوئے مگر قریب گئے تو دیکھا کہ یہ تو مٹی سونا ہیں اور ان کے چہروں پر غازہ کا ملمع چڑھا ہوا ہے تو سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

خورشید ایک کامیاب اداکارہ تھی اور بہترین مغنیہ بھی۔ کلکتہ کی فلمی صنعت میں کانن بالا کو بلبلِ بنگال کہا جاتا تھا تو بمبئی کی فلم نگری میں خورشید بلبلِ پنجاب کہلاتی تھی۔ 1919 میں ضلع لاہور کے ایک گاؤں میں ایک شریف گھرانے کے گھر میں پیدا ہوئی۔ ناچ گانے اور ایکٹنگ کا شوق شروع سے ہی تھا۔ کثرت سے فلمیں دیکھتی تھی اور گھر آنے کے بعد آئینے میں اداکاری کی مشق کرتی تھی۔ ماں باپ اسے ٹوکتے اور روکتے مگر یہ بے دھڑک ہو کر جواب دیتی "میں ایکٹرس بنوں گی"۔ تکمیلِ شوق کے لیے عمر کے چودھویں سال میں گھر سے بھاگ کر بمبئی چلی گئی۔ شریف والدین نے سر پیٹ لیا۔

فنکارانہ صلاحیت اور جوانی نے ساتھ دیا اور خورشید ہند ماتا سنے ٹون میں شریک ہو گئی جہاں فلم 'مرزا صاحباں' میں کام کیا۔ پنجاب کی ایک مشہور رومانی کہانی پر بنی یہ فلم کامیاب رہی اور خورشید کی کامیابی کے راستے کھل گئے۔ چہرے میں تو خاص جاذبیت نہیں تھی مگر اداکاری اچھی کر لیتی تھی اور گاتی بھی خوب تھی۔ کام ملنے لگا اور اس نے سور داس، بیٹی، نرس، پردیسی، مسافر، ہولی، چاندنی اور میری آنکھیں وغیرہ متعدد فلموں میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ تاریخی فلم 'شہنشاہ بابر' میں شیخ مختار کے ساتھ کام کیا۔ اس زمانے میں تاریخی فلمیں پکار، سکندر، ہمایوں، شاہجہاں بہت کامیاب رہی تھیں مگر خلافِ توقع 'شہنشاہ بابر' بری طرح پٹ گئی۔ انہی دنوں خورشید نے کے ایل سہگل کے ساتھ 'تان سین' میں بڑی اچھی ایکٹنگ کا مظاہرہ کیا اور کھیم چند پرکاش کی موسیقی کے تحت بڑے خوب گیت گائے۔ 'تان سین' میں اس کی گائی ہوئی میگھ ملہار 'برسو رے کالے بادروا' شائقین کو بڑی پسند آئی۔ ہر طرف سے خورشید کی ڈیمانڈ شروع ہو گئی۔ انہی دنوں اس نے کیرکٹر ایکٹر لالہ یعقوب سے شادی رچا لی۔ کچھ دن بعد میاں بیوی نے ماڈرن پکچرز کے نام سے اپنا ذاتی فلم ساز ادارہ بنایا اور پنجابی فلم 'پھولا' 'چوڑیاں' بنائی جو بد قسمتی سے پٹ گئی اور کافی مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

1947 میں ملک کی تقسیم کے بعد نہ جانے خورشید کو کیا سوجھی کہ وہ ہندوستان میں اپنی بنی بنائی مارکیٹ کو چھوڑ کر پاکستان منتقل ہو گئی جہاں اسے ملکۂ ترنم نور جہاں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں اس نے شوہر لالہ یعقوب کے اشتراک میں اپنی فلم بنائی۔ باہر کی ایک دو فلموں میں بھی رول ادا کیے مگر بات نہ بن سکی۔ وہ بمبئی واپس آئی اور کافی ہاتھ پیر مارے۔ وقت بدل چکا تھا، اب ثریا اور لتا منگیشکر کے نغمے لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ خورشید لوگوں کے دل سے اتر چکی تھی اور اب دوبارہ اس کی مارکیٹ کا بحال ہونا ناممکن تھا لہٰذا وہ مایوس ہو کر پاکستان لوٹ گئی اور کچھ سالوں بعد گمنام ہو گئی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ خورشید بچپن میں علامہ اقبال کی گود میں کھیلتی رہی کیوں کہ لاہور میں اس کا مکان اقبال کے پڑوس میں ہی تھا۔ دراصل پاکستان ہجرت کر کے اس نے بڑی غلطی کی جہاں اس کی مارکیٹ بالکل معدوم ہو گئی۔

●●●

تمل ناڈو میں تذکرہ نویسی اور لغت نویسی

ڈاکٹر جاوید حبیب
اکادمی آف اسلامک ریسرچ، 310 بھارتی داسن روڈ، ایس آئی ای ٹی میٹم پیٹ، چینئی-600018

تمل ناڈو کا علمی، ادبی اور دینی سفر ساڑھے تین سو سالوں پر محیط بہت جاندار اور وسیع رہا ہے، بالخصوص والا جاہی اور قطب شاہی دور میں عربی اور فارسی کے شعرا کا تذکرہ بڑی افادیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ عربی اور فارسی کی کئی اصناف اردو زبان میں داخل ہوئیں اور ہر میدان میں ارباب قلم نے اپنی صلاحیتوں کے بہترین جوہر دکھائے لیکن افسوس کہ اردو ادب کی پہلی ادبی تاریخ محمد حسین آزاد نے لکھی لیکن اس کتاب 'آب حیات' میں جنوب کی ادبی خدمات سے چشم پوشی اختیار کی گئی۔ ایسا کیوں ہوا، اس کا پس منظر وہی بہتر جانتے ہیں۔

تمل ناڈو میں تذکرہ نویسی اور لغت نویسی کے فن کو بھی عروج نصیب ہوا۔ اس ضمن میں بہت سارے نام لیے جاسکتے ہیں، مثلاً:

• نواب غوث خاں اعظم
☆ تذکرۂ صبح وطن (تذکرہ) [۱۸۴۱ء]، ☆ تذکرۂ گلزار اعظم [۱۸۸۷ء]، ☆ تذکرۂ سفینۃ النجات [۱۸۸۲ء]
• میر مہدی واصف
☆ تذکرۂ معدن الجواہر [۱۸۴۳ء]، ☆ تذکرۂ حدیقۃ المرام [۱۸۶۴ء]، ☆ دلیل ساطع (الف)، ☆ منتخب اللغات [۱۸۵۳ء]، ☆ انگریزی لغات [۱۸۵۱ء]
• مولوی عزیز جنگ بہادر
☆ تاریخ النوائط [۱۹۰۴ء]، ☆ آصف اللغات
• ذوقی ویلوری
☆ غرائب اللغات
• مولوی محمد صفی الدین ناصر
☆ تذکرۂ بہار اعظم جاہی
• مولوی مرزا اظفری
☆ اردو ہندی لغات، ☆ معروف اللغات
• میر اسماعیل خاں ابجدی
☆ زبدۃ الافکار (تذکرہ) [۱۷۸۰ء]
• میر حسن علی کرمانی ویلوری
☆ تذکرۂ بہادر الحکام
• حکیم غلام علی موسوی رضا
☆ تذکرۂ کرناٹک (فارسی)
• نواب محمد منور خاں گوہر مدراسی
☆ تذکرۂ سخنوران بلند نگر [۱۹۳۶ء]
• شیخ ابو ہاشم الشوقی (۱۸۹۳-۱۹۷۱ء)
☆ فتح نامہ محمود شاہی [۱۹۵۵ء]، ☆ تیمور نامہ [۱۹۵۸ء]، ☆ بادشاہ نامہ ارادت خاں [۱۹۵۸ء]
• حسرت سہروردی
☆ تذکرۂ شعرائے ظفر نگر
• مولانا حافظ باقوی
☆ نیر اعظم (تمل و شادام کے شعرا کا تذکرہ)
• مولانا یوسف کوکن (۹۰-۱۹۱۶)
☆ خانوادۂ قاضی بدرالدولہ [۱۹۶۳ء]، ☆ عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک [۱۹۷۴ء]
• علامہ قدوسی باقوی (۹۳-۱۹۲۸ء)
☆ حاصل مطالعہ (تذکرہ)، ☆ سیارگان جنوب (تذکرہ)
• مولوی خطیب عبدالمجید باقوی
☆ ماں باپ کے آداب و حقوق (تذکرہ)
• کاوش بدری (۱۹۲۸-۲۰۰۸ء)
☆ قدیم تمل ناڈو میں عربی اور فارسی (تذکرہ)، ☆ مولوی عبدالحق ساوی عرف دستگیر (تذکرہ)
• ڈاکٹر عابد صفی (۱۹۳۸-۲۰۰۸ء)
☆ متاع رفتگاں (تذکرہ)، ☆ تمل ناڈو میں اردو صحافت
• گنز و عبدالقادر باشاہ والمباڑی
☆ عرب تمل لغات
• مختار بدری (ولادت: ۱۹۳۹ء)
☆ اردو تمل لغات اور تمل اردو لغات [۲۰۰۳ء]
• علیم صبا نویدی
☆ تمل ناڈو میں اردو [۱۹۹۸ء]، ☆ تمل ناڈو کے مشاہیر ادب [۱۹۹۹ء]، ☆ خواتین تمل ناڈو کی دینی، علمی و ادبی خدمات [۲۰۰۱ء]، ☆ تمل ناڈو میں اردو رباعی [۲۰۰۳ء]، ☆ تمل ناڈو میں نعت گوئی [۲۰۰۳ء]، ☆ تاریخ ادب اردو (تمل ناڈو) انگریزی میں [۲۰۰۳ء]، ☆ 'روشن چہرے' تمل ناڈو کے ادبا و شعرا پر مضامین [۲۰۰۶ء]، ☆ تمل ناڈو کے رباعی گو شعرا کا شناخت نامہ [۲۰۱۳ء]، ☆ تمل ناڈو میں اردو کی سمت و رفتار (غیر مطبوعہ)، ☆ حیدرآباد کا شعر و ادب [۲۰۱۲ء]، ☆ کرناٹک میں جدید اردو نظم [۲۰۱۱ء]، ☆ اردو نظم کے سلسلے (پابند اور آزاد نظموں کا انتخاب) [۲۰۰۸ء]، ☆ جہان اردو رباعی (ہندستان کے رباعی گو شعرا پر مضامین) [۲۰۱۰ء]، ☆ جہان نور محمدی (ہندستان کے نعت گو شعرا پر مضامین) [۲۰۱۱ء]
• ڈاکٹر سید سجاد حسین (ولادت ۱۹۵۶ء)
☆ آثار و افکار (تذکرۂ شعرائے تمل ناڈو [۱۹۹۰ء]
• ڈاکٹر راہی فدائی
☆ مدرسۂ باقیات الصالحات ویلور کے علمی و ادبی کارنامے (تذکرہ) [۱۹۹۶ء]، ☆ دارالعلوم لطیفیہ ویلور ادبی منظر نامہ (تذکرہ) [۱۹۹۷ء]
• ڈاکٹر آصفہ شاکر
☆ تمل ناڈو میں اردو غزل (تذکرہ)

تمل ناڈو کا دور قدیم فارسی زبان و ادب سے مالا مال رہا ہے۔ یہاں علما، فضلا، ادبا اور شعرا کا اوڑھنا بچھونا فارسی ہی رہا ہے۔ نواب محمد علی والا جاہ کے دور میں بھی فارسی زبان ہی کا بہت زیادہ غلبہ رہا ہے اور نواب غوث خاں اعظم کے دور تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہی وجہ ہے کہ نواب اعظم کے دو تذکرے 'گلزار اعظم' اور 'صبح وطن' بھی فارسی زبان میں ہی شائع ہوئے جن میں یہاں کے علما، شعرا اور ادبا کا تفصیلی ذکر ہے۔ نواب اعظم کا دور اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ اس دور میں نواب اعظم نے اپنے خاص محل میں اردو مشاعروں کی بنیاد رکھی۔ اس دور کی افراتفری اور بدحواسی میں فرنگیوں نے اپنے پاؤں اس قدر پھیلائے کہ نوابین آرکاٹ کی حکومت اپنے نام کرلی اور آرکاٹ کی تمام تر جاگیروں پر اپنا بھرپور قبضہ جمالیا۔ یہ دور فرنگیوں کی چالاکی اور فریب کا نمایاں دور ہے جس کا ذکر سلطنت خداداد کے محقق محمد خان بنگلور نے خاص طور پر کیا ہے۔

مندرجہ بالا تذکروں اور لغات کی اشاعت یقیناً ناقابل فراموش ہے۔ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اردو میں تذکرہ نویسی کی ابتدا فارسی اور عربی تذکرہ نویسی کے بعد ہوئی۔ تمل ناڈو میں عربی اور فارسی کے تذکروں کا ایک خاصا ذخیرہ آج بھی یہاں کے قدیم کتب خانوں میں موجود ہے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ اس سے استفادہ کرنے والوں کا دور دور تک پتا نہیں چلتا ہے۔ آج کل قدیم ادب کا خزانہ قدیم کتب خانوں میں دیمک کی غذا بن رہا ہے اور اس کی حفاظت کرنے والے بھی جاں بحق ہوگئے ہیں۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی اور حکیم شمس اللہ قادری نے اپنے اپنے تذکروں میں ہمارے قدیم شعرا کی مثنویوں کا ذکر بڑی فراخ دلی اور وسیع النظری سے کیا ہے جو یورپ اور پاکستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان تذکروں کے مطالعے سے نہ صرف تمل ناڈو کی علمی، ادبی اور شعری رفتار کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ تاریخ ادب اردو میں تمل ناڈو کا ایک روشن باب بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔

ooo

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org